قرآنِ مجید کی اخلاقی اور قانونی تعلیمات

از قلم: مولانا محمد طاسین

الحمد للہ رب العالمین ۰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء والمرسلین ۰
محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین ۰ اما بعد فقد قال اللہ عزّوجلّ فی کتابہ
المبین: ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان وایتاءِ ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاءِ
والمنکر والبغی ۰ یعظکم لعلکم تذکّرون ۰ صدق اللہ العلی العظیم

میرے مقالے کا موضوع ہے: "قرآن مجید کی اخلاقی اور قانونی تعلیمات"، اور مقصد، قرآن مجید کی اخلاقی اور قانونی تعلیمات کا مختصر تعارف پیش کرنا اور کچھ ان خصوصیات اور مزایا پر روشنی ڈالنا ہے جو ان دو قسم کی قرآنی تعلیمات کو ایک دوسرے سے جدا اور ممیز کرتی ہیں، لیکن چونکہ گفتگو کا محور اور مدار، قرآن مجید ہے۔ لہٰذا مناسب سمجھتا ہوں کہ اصل مقصد سے پہلے کچھ خود قرآن مجید کے بارے میں بھی عرض کر دیا جائے۔

ہمارے اعتقاد کے مطابق، قرآن مجید، صحفِ سماویہ میں سے آخری صحیفہ اور کتبِ الٰہیہ میں سے اختتامی کتاب ہے جس کا نزول، آخری نبی و رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا جب وحی و رسالت کا مقدس سلسلہ اپنے انتہائی درجۂ کمال کو پہنچا، اور یہ کہ قرآن مجید رشد و ہدایت کے لحاظ سے ایک نہایت جامع اور مکمل کتاب، حقائق و معارف کا بحرِ ناپیدا کنار، بصائر و عبر کا گنج گراں مایہ، اور معنوی و صوری محاسن کے اعتبار سے نبیٔ آخر الزماں کا ایک دائمی معجزہ اور آپ کی صداقت پر روشن اور لاجواب دلیل ہے، اور یہ کہ سابقہ کتب سماویہ میں جو ہدایات و تعلیمات متفرق طور پر دی گئی تھیں وہ قرآن مجید میں اپنی صحیح ترین، کامل ترین، جامع ترین اور احسن ترین صورت میں موجود اور جلوہ گر ہیں اور قرآن حکیم اپنے سے پہلے نازل شدہ کتابوں کا مصدّق اور مہیمن ہے، اور چونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے لہٰذا بغیر کسی تغیر و تبدل اور ترمیم و تنسیخ کے اس کا اپنی حقیقی صورت میں محفوظ اور تا قیامت قائم رہنا، اس کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو اس سے پہلے کی کسی الہامی کتاب کو نصیب نہیں ہوئی، پھر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن حکیم رشد و ہدایت کے لحاظ سے ایک کامل نظام زندگی اور

جامع دستورِ حیات ہے تو اس کا کبھی یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کے اندر حیاتِ انسانی کے تمام جزوی مسائل کے لیے تفصیلی احکام موجود و مذکور ہیں کیونکہ یہ مطلب بداہۃً غلط ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا اور یہی ہو سکتا بھی ہے کہ اس کے اندر حیاتِ انسانی کے ہر شعبہ سے متعلق ایسے بنیادی اصول و تصورات تمام و کمال موجود ہیں جن میں تمام جزوی مسائل کے لیے کلی و اجمالی ہدایت و راہنمائی پائی جاتی ہے۔ اور اُن کی روشنی میں عقل و فکر رکھنے والے ہر جزوی مسئلہ کا اسلامی حل اور شرعی حکم بخوبی معلوم و متعین کر سکتے ہیں۔

اسی طرح قرآن مجید کے اصول و تصورات کے مجموعے کو لفظ نظام سے تعبیر کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ بے ربط قسم کے منتشر اور بکھرے خیالات نہیں بلکہ عقلی ترتیب کے ساتھ باہمدگر مربوط و منظم، اور سب کے سب بلا واسطہ اور بالواسطہ طور پر ایک متعین مقصد سے اس طرح ہم آہنگ وابستہ ہیں جس طرح کسی کُل کے تمام اجزاء، کُل کے مقصدِ وجود سے وابستہ اور ہم آہنگ ہوتے ہیں۔

قرآن مجید میں جتنی بھی ہدایات و تعلیمات ہیں وہ تمام تر بندوں کے فائدہ کے لیے ہیں اُن سے مقصود انسانوں کی ہمہ جہتی فوز و فلاح ہے دنیوی بھی اور اُخروی بھی، مادی بھی اور روحانی بھی، انفرادی بھی اور اجتماعی بھی، جہاں تک اُخروی فوز و فلاح کا تعلق ہے۔ قرآن مجید کے اپنے بیان کے مطابق اُس کا مطلب ہے۔ عذابِ جہنم سے دوری اور جنت کی سکونت اور حضوری، یعنی خوف و حزن سے پاک، ابدی اور لازوال امن و اطمینان کی زندگی جس میں ہر خواہش کے پورے ہونے کی مکمل ضمانت اور اُس کی تسکین کا پورا سامان ہو" لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ وَلَهُمْ مَا يَشْتَهُونَ ہ" جنت میں جنتیوں کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے اور جس کی اُن کے اندر اشتہاء اور خواہش پیدا ہوگی۔ اور انسان کی دنیوی فوز و فلاح کا مطلب ہے: خوف و حزن سے خالی پائیدار امن و اطمینان کی وہ خوشگوار زندگی نصیب ہونا جو اسباب کے ذریعے تمام فطری تقاضوں کی تکمیل اور تسکین سے وجود میں آتی ہے۔ اور جس کی طلب و خواہش ہر انسان کے اندر فطری اور پیدائشی طور پر پائی جاتی ہے۔ نیز جس میں انسان کی خلاقی و تخلیقی صلاحیتوں کو اُبھرنے اور بروئے کار آنے کا موقع ملتا ہے۔ جو اشیائے کائنات میں تصرف کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے اُسے ودیعت کی گئی ہیں۔

قرآنِ حکیم انسان کی دنیوی فلاح و کامیابی کے لیے ایک ایسے معاشرے کا قیام ضروری قرار دیتا ہے جس میں عدل اور احسان کا دَور دورہ ہو، یعنی جس میں نہ صرف یہ کہ بلا کسی تخصیص و امتیاز ہر ہر فرد کے ہر قسم کے حقوق ٹھیک ٹھیک اور پورے پورے محفوظ ہوں اور کسی کی کوئی حق تلفی نہ ہو

رہی ہو بلکہ افراد اپنے حقوق کا ایک دوسرے کے لیے ایثار کرتے اور فیاضی کے ساتھ ایک دوسرے سے پیش آتے ہوں، اور غالباً یہ اس لیے ضروری قرار دیتا ہے کہ اگر اس دنیا میں کسی فرد کو پائدار امن و اطمینان کی وہ خوشگوار اور ترقی پرور زندگی مل سکتی ہے جسے قرآن مجید نے حیاتِ طیبہ، حیاتِ حسنہ، عیشۃ راضیہ اور بُشریٰ وغیرہ سے تعبیر فرمایا اور ایمان کے ساتھ عملِ صالح کرنے والوں کو یقین دلایا ہے کہ انہیں بطور جزاء، آخرت کی جنت سے پہلے، اس دنیا میں بھی ہم حیاتِ طیبہ اور حسنہ سے نوازیں گے، تو ایسی زندگی ایک فرد کو صرف ایسے ہی انسانی معاشرے میں مل سکتی ہے جس میں عدل اور احسان کی کارفرمائی اور عملداری ہو، کیونکہ یہ ایک امرِ واقعہ اور ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ جس معاشرے میں ظلم و حق تلفی ہو اور افراد کے حقوق پوری طرح محفوظ نہ ہوں اس میں دیر سویر ایسے حالات ضرور رونما ہو کر رہتے ہیں۔ جو پورے معاشرے کو بدامنی و بے چینی میں مبتلا کر کے رکھ دیتے ہیں اور ظالم و مظلوم دونوں کو تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

قرآن مجید کے متعلق یہ چند اصولی باتیں عرض کرنے کے بعد، اب میں، پہلے قرآنی تعلیمات کا ایک عمومی اور اجمالی تعارف اور پھر اس کی اخلاقی اور قانونی تعلیمات کا، خصوصی اور تفصیلی تعارف پیش کرنا چاہتا ہوں،

قرآن مجید کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے اندر انسانی فوز و فلاح اور بشری نجات و سعادت کے متعلق جو ہدایات و تعلیمات ہیں اُن کا ایک بڑا حصہ ایمانی عقائد سے تعلق رکھتا ہے، ایمانی عقائد سے مراد ہیں: اللہ کی ذات و صفات کا عقیدہ، اللہ کے ملائکہ اور فرشتوں کا عقیدہ، اللہ کی آسمانی کتابوں کا عقیدہ، اللہ کے نبیوں اور رسولوں کا عقیدہ، حیات بعد الممات، حشر و نشر، قیامت اور اُخروی حساب و کتاب اور جزاء و سزا کا عقیدہ۔ ان عقائد میں سب سے بنیادی اور اساسی عقیدہ اللہ کی ذات و صفات اور توحید کا عقیدہ ہے جو تمام اسلامی تعلیمات کے لیے خشتِ اول اور سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے باقی عقائد اسی پر مبنی اور اسی کے فروع اور لوازم ہیں ان عقائد کا چونکہ ماوراء محسوسات اور مابعد الطبیعیات حقیقتوں سے تعلق ہے لہذا ایمانی عقائد سے متعلق ان تعلیماتِ قرآنی کو مابعد الطبیعاتی تعلیمات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، دراصل یہی وہ تعلیمات ہیں جو علم الکلام کا موضوع بنیں اور طول طویل اور دور از کار متکلمانہ مباحث نے ان کو بُری طرح اُلجھا کر رکھ دیا، بہر حال میں یہاں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان اعتقادی تعلیمات کے افادی پہلو کی بھی کچھ وضاحت عرض کی جائے۔

قرآن حکیم انسانی فوز وفلاح کی خاطر، جس قسم کا مثالی انسانی معاشرہ تجویز کرنا اور اس کے قیام پر زور دیتا ہے اس کے دو پہلو ہیں، ایک ذہنی وفکری اور دوسرا خارجی وعملی، ذہنی وفکری پہلو کے وجود میں آنے کا دارومدار قرآن مجید کی انہی اعتقادی اور ایمانی تعلیمات پر ہے، دراصل ان ہی اعتقادی اور ایمانی تعلیمات سے وہ خاص طرح کا ذہنی وفکری ماحول تیار ہوتا ہے جو قرآن مجید کی عملی تعلیمات کے عمل میں آنے اور پائداری کے ساتھ قائم رہنے کے لیے ضروری وناگزیر ہے۔ مطلب یہ کہ جس معاشرے میں وہ خاص طرح کا ذہنی ماحول موجود نہ ہو اس کے اندر اسلام کی عملی تعلیمات پر پہلے تو پوری طرح عمل میں نہیں ہو سکتا اور اگر کسی طور عمل ہو جائے تو پائداری کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا، مثلاً اسلام کی ان عملی تعلیمات کو لیجئے جو باہمی معاملات سے تعلق رکھتی اور جن کا یہ تقاضا ہے کہ دنیا کے ہر انسان کے ساتھ یکساں عدل وانصاف کیا جائے، ظاہر ہے کہ ان تعلیمات پر پوری طرح اور صحیح طریقہ سے وہی انسان عمل کر سکتا ہے جس کے ذہن میں عدل وانصاف کا نہایت وسیع اور عالمگیر جذبہ ہو یعنی جس کا دائرہ خاص رنگ، نسل، وطن، زبان سے تعلق رکھنے والے انسانوں اور مخصوص قوم، قبیلے اور خاندان کے افراد تک محدود نہ ہو بلکہ بلا کسی تخصیص وامتیاز پوری انسانیت تک وسیع اور ممتد ہو، جبکہ وہ انسان ایسی تعلیمات پر ٹھیک طریقہ سے عمل نہیں کر سکتا جس کے اندر جذبہ عدل تو ہو لیکن خاص رنگ ونسل، وطن وقوم اور قبیلے وخاندان سے تعلق رکھنے والے افراد تک محدود ہو، اور یہ حقیقت ہے کہ جذبۂ عدل میں عالمگیر وسعت صرف اللہ رب العٰلمین کے عقیدہ سے پیدا ہو سکتی ہے دوسرے کسی عقیدہ سے پیدا نہیں ہو سکتی، یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جہاں تک مطلق جذبہ عدل کا تعلق ہے ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر موجود ہوتا ہے تعلیم وتربیت سے صرف اس کی شکل کی تعین وتحدید ہوتی ہے، ٹھیک یہی حال جذبہ احسان وہمدردی کا بھی ہے ایمانی عقائد کی تعلیم سے وہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ اللہ رحمان ورحیم اور غفور وحلیم کے عقیدہ سے اس میں عالمگیر وسعت پیدا ہوتی اور وہ بلا تخصیص وامتیاز تمام انسانوں تک پھیل جاتا لہٰذا جس انسان کے اندر احسان وفیاضی کا وسیع وعالمگیر جذبہ ہو وہ اسلام کی ان عملی تعلیمات پر بآسانی اور بخوبی عمل کر سکتا ہے جو برو احسان پر مبنی اور ایثار کا تقاضا کرتی ہیں، اسی طرح اسلام کی ان عملی تعلیمات پر جو عبادات سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ شخص خوشی ودلجمعی کے ساتھ عمل کر سکتا ہے جس کے دل میں اللہ کی ذات وصفات اور آخرت کی جزا وسزا کا اعتقاد ویقین ہو اور وہ ان پر سچا ایمان رکھتا ہو، غرضیکہ ایمانی عقائد کی تعلیم سے ایک ایسا ذہنی پس منظر تیار ہوتا اور ایسا اخلاقی ماحول وجود میں آتا ہے جو اسلام کے عملی نظام کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

اعتقادی و ایمانی تعلیمات کا ایک بڑا فائدہ یہ کہ ان سے انسان کو ان بنیادی سوالات کے جوابات مل جاتے ہیں جو کائنات کے آغاز و انجام، انسان کے مبدا و معاد، کائنات میں انسان کی حیثیت و پوزیشن، خیر و شر اور نیکی و بدی کی حقیقت کے بارے میں انسانی عقل و ذہن میں پیدا ہوتے اور جواب نہ ملنے پر اسے مضطرب و بے چین رکھتے ہیں۔

اسی طرح ایمانی عقائد سے انسانوں کو نبی و رسول کی صورت میں خیر و نیکی اور صلاح و تقوے کا ایک کامل نمونہ اور مثالی پیکر ملتا ہے جس سے انہیں عملی زندگی میں نیکی و تقوے اور عدل و احسان کے عملی مطالب کو جاننے میں مدد ملتی اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیرت و کردار کے لحاظ سے ایک کامل و بہترین انسان کی عملی تصویر کیا ہے۔

قرآنی تعلیمات کا ایک دوسرا بڑا حصہ دینی عبادات سے تعلق رکھتا ہے، تعلیمات کے اس حصہ سے مراد وہ تعلیمات ہیں جو صلوٰۃ، زکوٰۃ، روزے، حج و عمرے، صدقہ و قربانی اور تبلیغ و جہاد وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں یہ تعلیمات دراصل اُس تعلیم پر مبنی ہیں جو اللہ کی ذات و صفات سے متعلق قرآن مجید میں مذکور ہے کیونکہ جہاں اللہ کی ذات و صفات کے متعلق اعتقاد و ایمان موجود نہ ہو وہاں اللہ کی کسی عبادت کا خیال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر غور سے دیکھا جائے تو ان عبادات کا بھی اُس مثالی معاشرے کی تشکیل سے گہرا اور مضبوط تعلق ہے جو اسلام بروئے کار لانا چاہتا ہے اور جس کے کچھ خدوخال کا پہلے ذکر کیا گیا، اُس عادلانہ معاشرے کی تشکیل میں عبادات کا جو رول اور کردار ہے وہ یہ کہ عبادات کے ذریعے ایک طرف ذہنوں میں ایمانی عقائد اور ان سے تشکیل شدہ احساسات نیکی و تقویٰ اور جذبات عدل و احسان، زندہ، بیدار، تازہ اور اُجاگر رہتے ہیں جن کی تحریک سے اعمالِ صالحہ کا صدور ہوتا ہے اور دوسری طرف ان عبادات پر عمل درآمد سے نفس انسانی کی اصلاح و تربیت ہوتی لہٰذا بندۂ مومن اُن احکام کی تعمیل اور پابندی میں زیادہ دقت محسوس نہیں کرتا جو اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق قرآن مجید نے تجویز کیے ہیں بلکہ اس کے لیے ان پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے، بشرطیکہ وہ عبادات صحیح ایمانی عقیدہ کے ساتھ سوچ سمجھ کر محض اللہ کی رضا و خوشنودی کی خاطر ادا کی جائیں، مطلب یہ کہ جو عبادات اللہ کے متعلق شرک آمیز عقیدے، ریاکاری اور بے سوچے سمجھے محض عادت اور رسم کے طور پر ادا کی جاتی ہیں ان سے مذکورہ فوائد حاصل نہیں ہو سکتے، نہ اس قسم کی عبادات، عبادت کرنے والے کو برائیوں سے روکتی اور نہ نیکیوں اور اچھائیوں پر اُبھارتی ہیں اور نہ اُن کے ذریعے وہ سازگار ذہنی فضا تیار ہوتی ہے جو اسلام کے عملی نظام کے نفاذ اور عمل میں آنے کے لیے ضروری

اور ناگزیر ہے۔

ان دو قسم کی تعلیمات کے ساتھ قرآنی تعلیمات کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جو اجتماعی زندگی کے مختلف امور و معاملات سے تعلق رکھتا اور جن پر عمل کرنے سے ایک ہر لحاظ سے معتدل و متوازن معاشرہ وجود میں آتا ہے جس کے اندر ہر ہر فرد کے لیے پائدار امن و اطمینان کی ضمانت ہوتی ہے، اس تیسری قسم کی تعلیمات میں سے بعض معاشرتی نوعیت کی ہیں جن میں سرفہرست وہ تعلیمات آتی ہیں جو خاندانی اور عائلی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں جیسے نکاح، مہر، نفقہ، طلاق، عدت، رضاعت، پرورش اولاد، اطاعت و خدمت والدین، حقوق زوجین سے متعلق تعلیمات، قرابتداروں کے حقوق، وصیت اور وراثت، نیز پڑوسیوں مسکینوں، فقیروں، یتیموں، معذوروں، مسافروں کے حقوق و مراعات سے متعلق تعلیمات، عورتوں اور غلاموں سے حسن سلوک، نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون، بنی آدم کی حیثیت سے ہر آدمی کے احترام، باہمی میل جول میں مساوات، ایک دوسرے کے گھر میں آنے جانے اور کھانے پینے، مجالس میں شریک ہونے کے آداب، میل ملاپ میں محرم اور غیر محرم اور بالغ اور نابالغ کے درمیان فرق اور خواتین کے لباس اور حجاب سے متعلق تعلیمات بھی معاشرتی نوعیت کی ہیں، انہی معاشرتی تعلیمات میں وہ تعلیمات بھی داخل ہیں جن میں لعن طعن، غیبت و چغلی ایک دوسرے کا مذاق و تمسخر اڑانے، ایک دوسرے کو برے ناموں اور برے القاب سے پکارنے، دوسروں کے چھپے عیبوں کی جستجو کرنے اور ٹوہ لگانے، رنگ و نسل، نسب خاندان قبیلے کی بنا پر خود کو شریف اور دوسرے کو حقیر و ذلیل سمجھنے کی ممانعت ہے نیز وہ تعلیمات بھی جن میں ہر مظلوم کی حمایت اور جھگڑنے والوں کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ صلح و صفائی کرنے کا حکم ہے، بہرحال ان معاشرتی تعلیمات کا مقصد افراد معاشرہ کے باہمی تعلقات کو مستحکم اور خوشگوار بنانا ہے۔

اس تیسری قسم کی اجتماعی تعلیمات میں سے کچھ معاشی نوعیت کی ہیں ان میں وہ تمام تعلیمات شامل ہیں جو قدرتی وسائل رزق سے رزق حاصل کرنے، ابتغاء رزق اور کسب معاش کے لیے سعی و محنت اور جدوجہد کرنے، مال و متاع کمانے میں حلال و جائز طریقوں سے کام لینے اور حرام و ناجائز طریقوں سے بچنے، شخصی ملکیت کے جواز اور اثبات، انتقال ملکیت کے اسباب، تجارتی لین دین اور خرید و فروخت میں عدل و قسط، ماپ تول میں کمی بیشی، اکل بالباطل، ربٰو، میسر و قمار، رشوت، چوری کی ممانعت سے متعلق ہیں، اسی طرح وہ تعلیمات بھی معاشی نوعیت کی ہیں جن میں تجارت، زراعت، گلہ بانی، اجرت پر محنت و مزدوری کرنے کا ذکر، اور ان لوگوں کی مذمت ہے جو محض جمع کرنے، بڑے سے بڑے مالدار

بننے اور دوسروں پر اپنی مالی برتری جتلانے کی غرض سے مال و منال کماتے اور ذخیرہ کرتے ہیں، اور جن کے اندر انفاقِ مال میں اسراف و تبذیر سے بچنے اور میانہ روی اختیار کرنے کا حکم ہے اور جن میں انفاق فی سبیل اللہ، زکوٰۃ و صدقات، قرضِ حسنہ کا بیان ہے، نیز جن میں مالِ غنیمت، فے، جزیہ کے احکام اور تقسیم مال کے ضابطے ہیں، بہرحال ان معاشی نوعیت کی تعلیمات سے مقصود یہ ہے کہ معاشرے کے تمام افراد کو معاشی خوشحالی کے ساتھ معاشی ترقی کے بھی مواقع حاصل ہوں، یعنی نہ صرف یہ کہ معاشرے کے ہر ہر فرد کو کسی نہ کسی شکل میں بالفعل اتنا سامان معاش ضرور میسر ہو جس کے بغیر عام طور پر ایک انسان اپنی طبعی عمر تک نہ اطمینان کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے اور نہ اپنے متعلقہ فرائض ٹھیک طور پر انجام دے سکتا ہے جو مختلف حیثیات سے اُس کے ذمہ پر عائد ہوتے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ اس کے لیے ضرورت سے زیادہ سامانِ معاش کما سکنے کا موقع بھی ہو کیونکہ انسان صرف یہی نہیں چاہتا کہ اس کے پاس بقدر ضرورت سامانِ معاش ہو بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کے پاس اپنی ذاتی ضرورت سے زائد رزق و مال بھی ہو تاکہ وہ اُسے مصارفِ خیر میں خرچ کر کے خالق اور مخلوق کی خوشنودی اور اخلاقی و روحانی ترقی حاصل کر سکے۔

قرآن مجید کی ان اجتماعی تعلیمات میں سے کچھ تعلیمات سیاسی نوعیت کی بھی ہیں اور یہ وہ تعلیمات ہیں جن میں خلافت، حکومت، بادشاہت، ملک، حکام، اُولو الامر، شوریٰ اور ایسے امور کا ذکر ہے جو بطور خاص ریاست و حکومت سے تعلق رکھتے اور اُس کے فرائض و وظائف میں شمار ہوتے ہیں، جیسے ظلم و فساد کا استیصال اور اس کی جگہ معاشرے میں عدل و قسط کا قیام، یعنی افراد کے ہر قسم کے حقوق کا مکمل اور ٹھیک ٹھیک تحفظ، لوگوں کے باہمی نزاعات میں عدل و انصاف کے مطابق عدالتی فیصلے، جرائم کے انسداد کے لیے مجرموں کو سزائیں دینا اور حدود و تعزیرات جاری کرنا، دشمنوں کے وار سے بچنے اور اُن کا مقابلہ کرنے کے لیے فوج اور سامانِ جنگ کی تیاری اور دفاعی تدابیر اختیار کرنا، غیر مسلموں سے معاہدات کرنا، لوگوں کو اُن کے دینی و دنیوی فرائض و واجبات کی ادائگی پر آمادہ اور تعلیم تبلیغ اور جہاد کا انتظام و اہتمام کرنا، افتراق و انتشار کے اسباب کو دور کر کے لوگوں میں اتحاد، تنظیم اور یگانگت پیدا کرنا، معاشرے سے اُن اسباب و محرکات کو مٹانے کی کوشش کرنا جو برائیوں کو جنم دیتے اور بدامنی و بےچینی کا باعث بنتے ہیں، نیز ایسے ہنگامی اور وقتی قسم کے اجتماعی مسائل کا حل باہمی صلاح و مشورے سے تلاش و تجویز کرنا جن کا فائدہ و ضرر پورے معاشرے   جن کا فائدہ و ضرر پورے معاشرے کو پہنچتا ہو اور جن کے متعلق قرآن و سنت میں صرف اصولی ہدایت پائی جاتی ہو، اسی طرح اجتماعی

بیت المال کے لیے زکوٰۃ، صدقات، غنیمت، فے، خمس، جزیہ و خراج کے اموال جمع اور پھر اُن کو اُن کے مقررہ مصارف میں خرچ کرنا، وغیرہ ظاہر ہے کہ یہ تمام مذکورہ امور حکومت و ریاست سے تعلق رکھتے اور سیاست کی تعریف میں آتے ہیں، اور جن کا مقصد پر امن اجتماعی ماحول اور سلامتی کی فضا قائم کرنا اور اپنے اجتماعی نصب العین کی طرف بڑھنا ہے۔

قرآنی تعلیمات کا ایک خاص حصہ وہ بھی ہے جو یہ تبلاتا ہے کہ وہ اچھے صفات کیا ہیں جن سے ایک مسلمان کو مزین اور آراستہ ہونا چاہیئے، اور وہ بُرے اوصاف کیا ہیں جو ایک مسلمان کے اندر نہ ہونے چاہئیں، اچھے صفات کی مثال، صداقت، امانت، شجاعت، سخاوت، وعدہ وفائی، پاکدامنی، نظافت تواضع، عاجزی، نرمی، صبر و تحمل، عفو و درگزر، استغناء، دوسروں کی ہمدردی و خیر خواہی وغیرہ اور بُرے اوصاف: جیسے کذب و جھوٹ، خیانت، بزدلی، بخل، عہد شکنی، بے حیائی، گندگی، فخر و تکبر، حسد و لالچ درشتگی و سخت مزاجی، غیظ و غضب، کتمان حق، مصلحت پرستی، نفاق وغیرہ۔ ان تعلیمات سے فرد کی انفرادی اور شخصی سیرت کی تعمیر ہوتی اور وہ ایک مثالی اسلامی معاشرے کا بہترین رکن ثابت ہوتا ہے گویا ان تعلیمات کا بھی اس مثالی معاشرے سے خصوصی تعلق ہے جس کا قیام اسلام کے پیش نظر ہے۔

اب میں اپنے مقالے کے اصل مقصد یعنی قرآن کی اخلاقی اور قانونی تعلیمات کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ قرآن مجید میں اجتماعی امور و معاملات سے متعلق جو تعلیمات ہیں خواہ وہ معاشرتی نوعیت کی ہوں یا معاشی و اقتصادی نوعیت کی، سیاسی نوعیت کی ہوں یا ثقافتی اور تہذیبی نوعیت کی، اسی طرح وہ ایجابی نوعیت کی ہوں یا امتناعی نوعیت کی، یعنی اُن میں کسی کام کے کرنے کا حکم ہو، یا کسی کام سے منع کیا گیا ہو، بلحاظ درجہ اور مرتبہ دو طرح کی ہیں۔ ایجابی تعلیمات میں کچھ واجب کے درجہ کی ہیں اور کچھ مستحب کے درجہ کی، اسی طرح امتناعی میں بعض حرام کے درجہ کی ہیں اور بعض مکروہ کے درجہ کی، مطلب یہ کہ اصل مقصد کے لحاظ سے جن کاموں کا کرنا ضروری ہے اُن سے متعلق تعلیمات فرض و واجب کا درجہ اور جن کاموں کا کرنا اگرچہ ضروری نہیں لیکن نہ کرنے سے اُن کا کرنا بہتر ہے۔ اُن سے متعلق تعلیمات مستحب کا مرتبہ رکھتی ہیں، اسی طرح جن اعمال کا نہ کرنا، مقصد کے لیے ضروری ہے۔ اُن سے متعلق تعلیمات کا درجہ حرام کا اور جن اعمال کا نہ کرنا، اُن کے کرنے سے بہتر ہے ان کے متعلق احکام کا درجہ، مکروہ کا ہے، اور یہ تقسیم دراصل اس مسئلے پر مبنی ہے کہ امر، وجوب کے لیے بھی ہوتا ہے اور ندب و استحباب کے لیے بھی، اسی طرح نہی، تحریم کے لیے بھی ہوتی ہے اور کراہت و تنزیہ کے لیے بھی، چنانچہ قرآنی اوامر میں سے بھی بعض کو واجب پر اور بعض کو مستحب پر محمول کیا گیا ہے اسی طور قرآن مجید کی نواہی میں سے بھی بعض کو تحریم

کے لیے اور بعض کو کراہیت کے لیے متعین کیا گیا ہے۔ رہا اس چیز کا تعین کہ کوئی امر وجوب کے لیے ہے یا استحباب کے لیے، یا کوئی نہی تحریم کے لیے ہے یا کراہیت کے لیے، سو وہ لفظی و معنوی قرائن سے بھی ہو سکتا ہے جو خود کلام میں موجود ہوتے ہیں اور عقلی و معروضی دلائل و شواہد سے بھی ہو سکتا ہے جو اُس سے الگ ہوتے ہیں، مثلاً کسی امر و نہی اور ایجابی و امتناعی حکم کے ساتھ تاکیدی الفاظ ہوں، یا اس کی خلاف ورزی اور عدم پابندی پر دنیوی، یا اُخروی سزا اور عذاب کی وعید اور دھمکی ہو تو اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ امر اور حکم وجوب کے لیے اور وہ نہی اور امتناعی حکم تحریم کے لیے ہے۔ اسی طرح اس کا تعین اُن مقاصد کی روشنی میں بھی ہو سکتا ہے جن سے اِن اوامر و نواہی اور شرعی احکام کا تعلق ہے۔ بہر حال غور سے دیکھا جائے تو شرعی احکام کی یہ درجہ بندی ضروری اور صحیح معلوم ہوتی اور عقل و فطرت کے عین مطابق نظر آتی ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا میرے علم و فہم کے مطابق قرآن مجید کا منشا یہ ہے کہ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے جس کے اندر عدل اور احسان پایا جاتا ہو، لہٰذا اس نے اپنی تعلیمات میں عدل و احسان دونوں کو ملحوظ و مد نظر رکھا ہے، چونکہ عدل کے معنے ہیں، ایک دوسرے کو اس کا حق ٹھیک ٹھیک اور پورا پورا دینا، لہٰذا عدل پر مبنی تعلیمات کی خاصیت یہ ہے کہ ان پر عمل پیرا ہونے سے افراد کے حقوق ٹھیک ٹھیک محفوظ ہو جاتے اور ایک ایسا معتدل و متوازن اور خوشگوار اجتماعی ماحول وجود میں آتا ہے جس کے اندر ہر فرد کو اپنی طبعی عمر تک اطمینان کے ساتھ زندہ رہنے اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق ترقی کرنے کا موقع ملتا ہے، اور اُن کی عدم پابندی اور خلاف ورزی سے ضرور حق تلفیاں واقع ہوتی، معاشرے کا اجتماعی توازن بگڑتا اور افراد کو بدامنی و بے چینی میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ اور چونکہ احسان کے معنی ہیں، اپنے حق کا دوسرے کے لیے ایثار کرنا، یا دوسرے کی خاطر اپنے حق سے دستبردار ہو جانا، لہٰذا احسان پر مبنی تعلیمات کی خصوصیت یہ ہے کہ اُن پر عمل کرنے اور کاربند ہونے سے اجتماعی تعلقات زیادہ سے زیادہ مستحکم و خوشگوار بنتے اور اُس اجتماعی امن و اطمینان میں برابر اضافہ ہوتا ہے جو عدل پر مبنی تعلیمات پر عمل کرنے کے نتیجہ میں پہلے سے پیدا ہو چکا ہوتا ہے، لیکن اُن پر عمل نہ کرنے سے نہ تو کسی کی حق تلفی ہوتی، نہ کسی کو کوئی ضرر و نقصان پہنچتا اور نہ معاشرے میں کوئی بدامنی و بے چینی ظہور میں آتی ہے۔ دوسرا فرق ان دو قسم کی تعلیمات کے درمیان یہ کہ عدل والی تعلیمات لازمی اور جبری ہیں جبکہ احسان والی تعلیمات جبری نہیں اختیاری ہیں، عدل والی تعلیمات کی خلاف ورزی گناہ اور قابل تعزیر جرم ہے جبکہ احسان والی تعلیمات کی خلاف ورزی نہ گناہ ہے اور نہ قابل سزا جرم، یہی وجہ ہے کہ حکومت

عدل والی تعلیمات کی پابندی پر تو مسلمان شہریوں بلکہ سب شہریوں کو مجبور کر سکتی ہے کیونکہ اس کے وجود کا اصل مقصد، معاشرے میں عدل و قسط کا قیام ہے لہذا اس کا یہ منصبی فریضہ قرار پاتا ہے کہ ہر وہ کام اور تصرف کرے جس سے عدل قائم ہو سکتا ہو، اور چونکہ یہ عدل، عدل والی تعلیمات پر عمل کرنے کرانے سے قائم ہو سکتا ہے لہذا ان تعلیمات کا نفاذ اور تحفظ حکومت کا فریضہ ٹھہرتا ہے، لیکن اسلامی حکومت کسی کو احسان والی تعلیمات کی پابندی پر مجبور نہیں کر سکتی، البتہ ایک اسلامی حکومت جس کے اسلامی فرائض میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی ہے افراد کو احسانی تعلیمات پر عمل کی ترغیب ضرور دلا سکتی ہے جس کی صورت یہ کہ جو افراد ان احسانی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں انہیں خاص مراعات اور قومی اعزازات سے نواز کر ان کی عزت افزائی اور حوصلہ افزائی کر سکتی ہے بلکہ اُسے ایسا ضرور کرنا چاہیئے۔

ایک اور فرق ان دو قسم کی تعلیمات کے مابین یہ بھی ہے کہ عدل میں چونکہ ایک شخص دوسرے کو اس کا واجبی حق دیتا، جبکہ احسان میں وہ اپنے حق کا دوسرے کے لیے ایثار کرتا ہے لہذا نیکی اور اجر و ثواب میں عدل کا درجہ احسان سے کم اور دُوسرا ہے، عدل کے مقابلہ میں احسان کرنے والے کو ہر دین و مذہب اور ہر سوسائٹی میں زیادہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے گویا دین و دانش دونوں کے نزدیک احسان، عدل سے بہتر ہے، اگر عدل اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ہے تو احسان عین تقویٰ ہے جس سے بڑھ کر کوئی نیکی اور اچھائی نہیں۔

ان دونوں کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے کہ عملی ترتیب کے لحاظ سے عدل پہلے اور احسان اس کے بعد ہے جو شخص عدل پر عمل پیرا نہ ہو وہ احسان پر عمل نہیں کر سکتا، مطلب یہ کہ جو شخص دوسروں کو اُن کا واجبی حق ٹھیک ٹھیک نہ دیتا ہو وہ اپنے حق کا دوسروں کے لیے ایثار کیسے کر سکتا ہے غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی آیت اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ، میں عدل کا حکم احسان کے حکم سے پہلے اور مقدم ہے۔

ایک فرق عدل اور احسان کے درمیان یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عدل کا عملی مصداق اپنے کم و کیف کے لحاظ سے متعین ہے حالانکہ احسان کا عملی مصداق اور مطلب کم و کیف کے اعتبار سے متعین نہیں، بالفاظ دیگر عدل کی ہر معاملے میں ایک ہی متعین شکل ہوتی ہے جبکہ احسان کی متعدد شکلیں ہو سکتی ہیں، مثال کے طور پر ایک مستاجر نے اجیر سے بیس روپے یومیہ پر معاملہ کیا، کام ختم ہونے پر وہ شام کو اجیر کو پورے بیس روپے دیتا ہے تو اس معاملے میں یہ عدل ہے جس کی ایک ہی متعین شکل ہے، اور اگر اس کو بیس روپے سے زائد دیتا ہے تو یہ احسان ہے، اس زائد کی چونکہ کثیر التعداد

شکلیں ہو سکتی ہیں زائد ایک پیسہ بھی ہو سکتا ہے ایک روپیہ بھی ہو سکتا ہے پانچ روپے، دس روپے بیس روپے، سو روپے بھی ہو سکتے ہیں لہذا اس کے مطابق احسان کی سینکڑوں عملی شکلیں ہو سکتی ہیں، اسی طرح اس مثال میں اجیر کو بیس روپے سے ایک پیسہ کم دینا بھی ظلم، ایک روپیہ کم دینا بھی ظلم، پانچ اور دس روپے کم دینا بھی ظلم اور پورے کے پورے بیس نہ دینا بھی ظلم ہے لہذا مثال مذکور میں ظلم کی تقریباً دو ہزار شکلیں ہو سکتی ہیں لیکن عدل کی صرف ایک ہی متعین شکل ہے اور وہ ہے پورے بیس روپے دینا جو شروع میں بطور حق طے ہوئے، اس مثال سے یہ بھی واضح ہوا کہ عدل، احسان اور ظلم کے درمیان حدِ فاصل اور ما بہ الامتیاز ہے اس کی ایک طرف کا نام احسان اور دوسری طرف کا نام ظلم ہے، اور یہ کہ عدل کا میدان محدود اور احسان کا میدان غیر محدود ہے اس میں ایک انسان جتنی چاہے جولانیاں دکھا سکتا ہے، اور یہ کہ احسان وہ سعادت ہے جس میں انسان ایک دوسرے پر مسلسل سبقت و برتری حاصل کر سکتے ہیں، اور یہ کہ عدل کے مقابلہ میں احسان ہمیشہ ایک آئیڈیل رہتا ہے اس لیے کہ وہ کبھی بھی آخری طور پر عمل میں نہیں آسکتا۔

قرآن مجید کی ان دو قسم کی تعلیمات عدلی اور احسانی کی خصوصیات کے بارے میں جو تفصیل عرض کی گئی ہے اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ان دو قسم کی تعلیمات کے مابین مختلف وجوہ سے کیا فرق و امتیاز ہے۔

سامعین کرام! آپ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن و حدیث اور قدیم عربی لٹریچر میں لفظ قانون کا کہیں کوئی ذکر نہیں دراصل یہ لفظ عربی نہیں بلکہ یونانی یا سریانی ہے، یونانی کتابوں کے جب عربی زبان میں ترجمے ہوئے تو لفظ قانون کو بعینہٖ لے لیا گیا، لکھا ہے کہ اس کا لغوی معنیٰ تو کتاب کی ایک سطر تھا لیکن اصطلاح میں قانون کا مطلب ایک ایسا اصل کلی قرار پایا جو اپنی تمام جزئیات پر منطبق ہوتا اور اُن کے احکام ما حوال کی معرفت کا ذریعہ بنتا ہے۔ دستور العلماء نامی کتاب میں قانون کی دو تعریفیں لکھی ہیں: ایک یہ کہ: "القانون هو الامر الكلى المنطبق على جميع جزئياته التى يتعرف احكامها منه" اور دوسری یہ کہ "القانون قضية كلية تعرف بالقوة القريبة من الفعل احوال جزئيات موضوعها" اس دوسری تعریف کے بموجب قانون اور قاعدہ دونوں ہم معنے ہو جاتے ہیں کیونکہ قاعدہ کی بھی یہی تعریف کی گئی ہے۔

ان دو تعریفوں کے مطابق قانون کا اطلاق، وضعی علوم و فنون کے اُن قواعد کلیہ پر بھی ہوتا اور ہو سکتا ہے جن سے علم و فن کے جزوی مسائل سمجھنے اور حل کرنے میں مدد ملتی ہے، خواہ وہ قواعد کلیہ

گرامر اور صرف و نحو کے ہوں یا منطق و فلسفہ کے، ریاضی اور طبیعات کے ہوں یا طب اور کیمیا کے، عمرانیات کے ہوں یا معاشیات اور سیاسیات کے۔ اسی طرح ان تعریفوں کے لحاظ سے قانون کا اطلاق اُن اصول و ضوابط پر بھی ہوتا اور ہو سکتا ہے جن کے مطابق دیوانی اور فوجداری عدالتیں لوگوں کے باہمی تنازعات کا تصفیہ اور مقدمات کے فیصلے کرتی ہیں قطع نظر اس سے کہ وہ اصول و ضوابط دینی ہیں یا غیر دینی وہ کس نے وضع کیے اور کہاں سے آئے، نیز اس لحاظ سے قانون کا اطلاق اُن معاشرتی، معاشی اور سیاسی طور طریقوں اور رسموں، رواجوں اور عرفوں پر بھی ہو سکتا ہے جنکو قبول عام کی حیثیت حاصل ہو جاتی لوگ احترام کے ساتھ اُن کی پابندی کرتے اور اُن کے مطابق زندگی گزارتے ہیں خواہ ان کا ماخذ و سرچشمہ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔

علماء قانون نے اپنی کتابوں میں قانون کی جو اصطلاحی تعریفیں لکھی ہیں وہ متعدد اور مختلف ہیں، اُن میں سے ایک تعریف کچھ اس طرح ہے "قانون ظاہری انسانی افعال کا عام قاعدہ ہے جسے کوئی اعلیٰ حاکم نافذ کرے اور جس کی پابندی تعزیراً لازم ہو" اس تعریف سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علمائے قانون کے نزدیک صرف وہی عام ضابطہ اور کلی قاعدہ قانون کا مصداق ہوتا ہے جس میں تین باتیں ہوں ایک یہ کہ وہ انسان کے ظاہری اعمال و افعال سے متعلق ہو، دوم اُسے نافذ کرنے والی ہستی صاحب حکومت و اقتدار ہو، یعنی جس کے نفاذ کا تعلق حکومت سے ہو، اور سوم یہ کہ اس کی پابندی لازمی و جبری اور خلاف ورزی قابل تعزیر جرم ہو۔

بنابریں قانون کی پہلی دو تعریفوں کے مطابق قرآن مجید کی وہ تمام تعلیمات جن کے اندر حیات انسانی کے مختلف النوع مسائل کے متعلق اصول کلیہ اور ضوابط عامہ بیان ہوئے ہیں خواہ وہ عدل پر مبنی ہوں یا احسان پر، اسی طرح وہ اجباری قسم کے ہوں یا اختیاری قسم کے، وہ تمام تعلیمات، قانونی تعلیمات کا مصداق قرار پاتی ہیں، جبکہ قانون کی تیسری تعریف جو علماء قانون کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔ قرآن مجید کی صرف وہ تعلیمات، قانونی تعلیمات کے ذیل میں آتی ہیں جو عدل پر مبنی اور جن کی پشت پناہی کا تعلق حکومت سے ہوتا ہے۔

اسی طرح علم الاخلاق کی کتابوں میں علماء اخلاق نے اخلاق کی جو تعریفیں لکھی ہیں ان کے درمیان بھی اختلاف ہے، بعض تعریفوں کے مطابق ہر نیکی اور اچھائی اخلاق کا مصداق قرار پاتی ہے خواہ وہ عدل سے تعلق رکھتی ہو، یا احسان سے، اور بعض دوسری تعریفوں کے مطابق، سب نیکیاں اور اچھائیاں نہیں بلکہ بعض مخصوص قسم کی نیکیاں اور اچھائیاں اخلاق کے تحت آتی ہیں جو احسان سے تعلق

رکھتی ہیں، لہٰذا اخلاق کی پہلی تعریف کی رو سے قرآن مجید کی تمام تعلیمات، اخلاقی تعلیمات اور دوسری تعریف کی رو سے صرف بعض تعلیمات اخلاقی قرار پاتی ہیں۔

بہر حال قانون اور اخلاق کی بعض تعریفوں کے بموجب یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کی جو تعلیمات عدل پر مبنی ہیں وہ قانونی اور جو احسان پر مبنی ہیں وہ اخلاقی تعلیمات ہیں اور جن کے مجموعے کا نام شریعت ہے۔

مقالہ ختم کرنے سے پہلے قرآنی تعلیمات کی ایک اور قسم کی طرف توجہ مبذول کرانا مناسب سمجھتا ہوں جو ہیں تو اس لحاظ سے قانونی نوعیت کی کہ اپنے وقت پر اُن کی پابندی لازمی و ضروری اور اُن کے نفاذ اور تحفظ کی ذمہ داری حکومت پر ہے لیکن چونکہ تعلیمات کی اس قسم کا تعلق مسلم معاشرے کے عبوری اور ہنگامی حالات سے ہے۔ لہٰذا ان کو عبوری اور غیر مستقل قانونی تعلیمات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، یہ تعلیمات نہ عدل پر مبنی ہیں اور نہ احسان پر بلکہ وقتی مصلحت پر مبنی ہیں جس کا مطلب ہے معاشرے میں پہلے سے موجود ظلم و فساد میں کچھ کمی اور اجتماعی حالت کی نسبتاً کچھ بہتری۔

اس اجمال کی کچھ تفصیل یہ کہ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ قرآن مجید کی وہ تعلیمات جن کی بنیاد عدل اور احسان پر ہے۔ ان کے صحیح طور پر عمل میں آنے اور پائداری کے ساتھ قائم رہنے کے لیے ایک خاص طرح کا ذہنی اور خارجی ماحول ضروری اور شرط مقدم ہے۔ خاص طرح کے ذہنی ماحول سے مُراد وہ ماحول ہے جو ایمانی عقائد کی تعلیم سے وجود میں آتا اور اسلامی عبادات کی تربیت سے قائم، زندہ اور بیدار رہتا ہے جس کی بعض خصوصیات کی پہلے کچھ وضاحت پیش کی جا چکی ہے اور خاص طرح کے خارجی ماحول سے مُراد ہے مسلم معاشرے کا اپنی معاشی ضرورّیات کے لحاظ سے خود کفیل و مستغنی اور سیاسی امور کے لحاظ سے مکمل آزاد اور خود مختار ہونا۔ ظاہر ہے کہ جو مسلم معاشرہ اپنی معاشی ضرورّیات کے لیے غیر مسلموں کا محتاج اور دست نگر، اور سیاسی لحاظ سے غلام اور ان کی مرضی کا پابند ہو وہ کبھی بھی اسلام کے حقیقی عملی نظام پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا، اسی طرح وہ معاشرہ بھی اسلام کے حقیقی عملی نظام پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا جس کے اندر وہ ذہنی فضا موجود نہ ہو جس کے ساتھ اسلام کے عملی نظام کا نہایت گہرا اور مضبوط تعلق ہے۔

البتہ جس مسلم معاشرے میں اب تک وہ خاص طرح کا ذہنی اور خارجی ماحول پیدا نہ ہو سکا اور وہ ایک بَین بَین حالات سے گزر رہا ہو یعنی نہ اُس کے اندر عمومی طور پر عدل و احسان کے عالمگیر جذبات و احساسات ذہنوں میں پائے جاتے ہوں اور نہ وہ معاشی ضروریات کے لحاظ سے پوری طرح خود کفیل

اور سیاسی لحاظ سے پوری طرح آزاد و خود مختار ہو بلکہ اس کی حالت درمیانی سی ہو وہ چونکہ اسلام کی عدل واحسان والی تعلیمات کو پوری طرح اپنا نہیں سکتا، لہٰذا اس کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر قرآن حکیم اس کو ایسے احکام وقوانین اختیار کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی اجازت دیتا ہے جو اگرچہ اسلام کے اصل منشاء کے مطابق اور درست نہیں ہوتے لیکن چونکہ اُن حالات میں وہی اس کے لیے قابلِ عمل ہوتے اور انہی کے ذریعے اسکی کچھ نہ کچھ اصلاح ہوسکتی اور نسبتاً اسکی اجتماعی حالت بہتر بن سکتی ہے لہٰذا ایسے معاشرے کے لیے اُن عبوری قسم کے احکام وقوانین پر عمل کرنے کا جواز پیدا ہو جاتا ہے اور یہ جواز صرف اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک کہ وہ ذہنی اور معنوی حالات بدل نہیں جاتے جن کے ساتھ اس جواز کا تعلق ہوتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو یہ عبوری احکام وقوانین جس حکمتِ عملی پر مبنی نظر آتے ہیں وہ یہ کہ جب دو برائیوں میں سے ایک کا اختیار کرنا ضروری اور ناگزیر ہو تو اُن میں سے اس کو بادلِ نخواستہ اختیار کرلیا جائے جو ضرر میں نسبتۃً کم درجہ کی ہو، اور یہ کہ وہ تھوڑی صلاح وبہتری جو پائدار ہو اُس زیادہ صلاح وبہتری پر ترجیح رکھتی ہے جو ناپائدار ہو، اور چونکہ یہ حکمتِ عملی دین ودانش اور عقل وفطرت کے عین مطابق ہے لہٰذا اس پر مبنی احکام وقوانین کے صحیح ودرست ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوسکتا۔ البتہ اس بارے میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ مذکورہ حکمتِ عملی کی رو سے صرف اس مسلم معاشرے کو عبوری احکام وقوانین اختیار کرنے کی اجازت ہوتی ہے جس نے یہ طے کرلیا ہو کہ وہ بالآخر اسلام کے حقیقی اور کامل عملی نظام کو اپنائے گا اور وہ اس کے لیے لباط بھر اور حتی الوسع سعی وکوشش میں مصروف بھی ہو۔

اسلام کی انقلابی قدروں کا علمبردار
ماہنامہ میثاق لاہور
مدیر: ڈاکٹر اسرار احمد

خود پڑھیے اور دوسروں کو پڑھایئے
فی شمارہ تین روپے — سالانہ زرِتعاون تیس روپے
قریبی بک اسٹال سے حاصل کریں یا ہم سے طلب فرمائیں
مکتبہ تنظیم اسلامی — ۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون نمبر- ۸۵۲۶۱۱